انسانِ کامل ﷺ

پروفیسر حمید احمد خاں

سلفیہ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ ٹرسٹ جموں و کشمیر
جمعیۃ منزل، بربرشاہ، سری نگر۔ ۱۹۰۰۱

Scanned with OKEN Scanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانِ کامل

جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل قرار دیتے ہیں تو بالعموم ہماری مُراد یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس میں عالمِ انسانیت کی اخلاقی خوبیاں انتہائے کمال کو پہنچ گئی تھیں۔ امانت، صداقت، شجاعت، عدالت، محاسنِ اخلاق کا کونسا پہلو ہے جو حضورؐ کی اس شانِ اکملیت پر گواہی نہیں دیتا؟ لیکن اگر اس اندازِ فکر سے قطع نظر کیجیے اور عالمِ اخلاق کی انتہائی بلندیوں کے بجائے اِس کی وسعت و جامعیت کو معیارِ کمال قرار دیجیے تو رسول پاکؐ انسانیت کاملہ کے ایک ایسے پیکر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جس کی دوسری نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ انفرادی اور اجتماعی فضائلِ اخلاق کی رنگ برنگ روشنیاں باہم ترکیب پاکر نورِ رسالت میں اس طرح شامل ہوئی ہیں کہ زمانہ خُلقِ عظیم کے ایک نئے مفہوم سے آشنا ہوا ہے۔

طبیعیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ ہماری آنکھ کو روشنی کا احساس سات مختلف رنگ کی روشنیوں کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ یہ سات رنگ، الگ الگ بھی اپنا اپنا مخصوص فائدہ رکھتے ہیں۔ لیکن طبعی حالات میں انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ نور کی شعاع ہفت رنگ کی اس ترکیبی صورت کو پسند کرے جسے عرفِ عام "سفید روشنی" کے نام سے موسوم کرتا ہے، اور جو تمام الوانِ معلومہ پر حاوی ہونے کے باوجود کسی ایک رنگ میں محدود نہیں ہے۔ انسان کی رُوحانی تاریخ اس طبیعی کیفیت کے ساتھ ایک عجیب دلپذیر نسبت رکھتی ہے۔ قدیم الایام سے انبیاءِ کرامؑ اپنی اپنی امت کی رہنمائی اور خاص خاص مقاصد کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتے رہے، اور اس مقصد کو انجام دینے کی

غرض سے دینِ برحق کے خاص خاص پہلوؤں کو روشن کرتے رہے۔ کسی نے جن و انس اور مرغ و ماہی پر شاہانہ فرمانروائی کی اور قوتِ ایمان کے کرشمے دکھائے۔ کسی نے فقر و فاقہ میں زندگی کے دن گزارنے اور ہجوم مصائب کے مقابلے میں انتہائی صبر سے کام لے کر اہلِ تقویٰ کی شان درویشی کو آشکار کیا۔ کسی نے اللہ تعالیٰ کی تیغِ جلال بن کر میدانِ جہاد میں اعلائے کلمۃ الحق کیا اور کسی نے حلم و آشتی کی مجسّم تصویر بن کر طغیان و تمرد کو بھی تسلیم و رضا سے تسخیر کرنے کی تلقین کی۔ غرض ان نفوسِ قدسیہ میں سے ہر ایک نے دینِ فطرت کے مسائل کو کسی نہ کسی مخصوص رنگ میں حل کیا، لیکن یہ بظاہر متفاوت تعلیمات ایک ہی کل کے منتشر اجزاء، ایک ہی آفتاب کی ہزار رنگ تجلیاں تھیں۔ ان متنوع تجلیات کو ابھی ایک نقطے پر جمع ہو کر غارِ حرا سے طلوع ہونا تھا تاکہ مشرق اور مغرب، حال اور مستقبل، یکساں طور پر منور ہو جائیں۔

اِس قول سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کا پیغام بجز اُن کی اپنی اپنی قوم کے کسی دوسرے کے لیے درست نہ تھا، یا کسی خاص دور کے گزر جانے کے بعد اُن کے اِرشادات کی صحت میں کلام کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان انبیاء کا اِنکار جزواً دینِ اسلام سے اِنکار ہے، کیونکہ جس دینِ قیّم کے لیے قرآن مجید نے اسلام کی اصطلاح وضع کی، اس کا سُراغ تاریخ میں چودہ صدیوں سے بہت پیچھے تک پہنچتا ہے۔ پھر بھی یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ انبیائے متقدمین کا ظہور مخصوص حالات میں مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے ہوا تھا، اِس لیے اُن کی زندگی اُس عمومیت سے لامحالہ عاری ہے جو تمام نوعِ انسانی کی تہذیبِ نفس اور تزکیۂ اخلاق کے لیے کوئی مکمل اور جامع ضابطہ پیش کر سکے۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ کے ظہور سے پہلے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت قائم رہی۔ کیونکہ کسی ایک فرستادۂ حق نے دینِ فطرت کو کامل اور مکمل نہ کر دیا تھا۔ زمانے نے تمام انبیاء کی ضرور اُن سنتوں کو محفوظ رکھا جن کے وہ مظہرِ کامل تھے اور جن سے انسان کو عالمگیر پیمانے پر نفع پہنچ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان انبیاء میں سے

ہر نبی کے ساتھ ہم ایک خاص ایمانی شان منسوب کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی توحید شناسی و حق پرستی، حضرت موسیٰؑ کا ذوقِ جہاد و احترامِ شریعت، حضرت ایوبؑ کا صبر و رضا، حضرت عیسیٰؑ کا حلم و محبت، ان انبیائے کرام کی امتیازی نشانیاں ہیں مگر حضور خاتم النبیینؐ کے متعلق اس قسم کی تخصیص و تحدید سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں توحیدِ ابراہیمؑ بھی ہے اور حیائے یوسفؑ کے ساتھ ساتھ موسویؑ ذوقِ جہاد بھی۔ صبرِ ایوبؑ بھی ہے اور حلمِ مسیح بھی۔ پھر جب دنیا نے دیکھ لیا کہ کوئی ایک ذات کس طرح بدرجۂ اتم ان متعدد صفات کی جامع ہو سکتی ہے تو نبوت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اگر بعثتِ انبیاء کا معاملہ کسی حد تک تاریخی اسباب و عوامل سے بھی اثر پذیر رہے (اور ابنِ خلدون کا دعویٰ یہ ہے کہ اُمتوں کا تاریخی اور جغرافیائی ماحول یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اُن کے درمیان کوئی رسول مبعوث ہوگا یا نہیں) تو یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ انبیائے متقدمین کے زمانے میں انسانی ضرورت اور مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ حضرت موسیٰؑ کا پیغام تھا: "آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں"۔ بخلاف اس کے جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی کہ "بدی کا مقابلہ نہ کرو بلکہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو"۔ بادی النظر میں یہ تفاوت شاید تناقض معلوم ہو، لیکن فہمِ سلیم پر خود بخود روشن ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ اور نہ حضرت مسیح (علیہما السلام) کی مقدس سنت ہی سچائی سے خالی ہے۔ ایک میں خدا کی شانِ جلال اور دوسری میں شانِ جمال جھلک رہی تھی۔ ان مختلف شئونِ الٰہیہ نے ابھی تک کسی ایک ذات کو اپنے ظہور کا مرکز نہیں بنایا تھا۔ اور زمانہ ابھی اُس گھڑی کے انتظار میں تھا جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغام پر تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کی مہر ثبت کرتا اور عالمِ بشریت کے اخلاقی جزو و کُل کے فرق کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا۔

عرب کے گلیم پوش شہنشاہ کی ذاتِ اقدس میں اس قدر متفرق بلکہ بظاہر متخالف فضائلِ اخلاق جمع نظر آتے ہیں کہ عقل اس وصل دہندۂ دین و دنیا کی داستانِ حیات پر نظر ڈال کر ششدر رہ جاتی ہے اور ہمارا ذہن جرمن فلسفی ہیگل کے نظریۂ اتحادِ

اضداد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ زندگی کی حقیقت جدلی ہے۔ ہر حقیقت کا ظہور ایک دعویٰ کی شکل میں ہوتا ہے پھر ایک اور حقیقت ردّ دعویٰ بن کر اس دعویٰ کی نفی کرتی ہے اور اس کے بعد ان دونوں کے امتزاج سے ایک مرکب دعویٰ وجود میں آتا ہے۔ بعض خصائلِ حمیدہ کی نوعیت ایسی ہے کہ عوام اُن کے ظاہری تناقض کی بنا پر خیال کرتے ہیں کہ ان کا یکجا ہونا ناممکن ہے۔ لیکن درحقیقت یہ متعدّد اور مختلف اخلاقی قوتیں باہم تکملہ و تتمّہ کا تعلق رکھتی ہیں۔

رسول اللہ صلعم کے متعلق ایک جلیل القدر صحابی ابو سعید الخدری رضؓ کا قول ہے کہ آنحضرت صلعم دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے چنانچہ روایت ہے کہ جب کوئی خطا کار سامنے آکر معافی کا طالب ہوتا تو خود معاف کرنے والے کی گردن شرم سے جُھک جاتی اور روئے انور پر فرطِ حیا سے سُرخی دوڑ جاتی۔ ایسی عفیف اور بے لوث، ایسی پُرسکون اور منکسر طبیعت کے انسان کا رہنمائے عوام کی حیثیت سے عرصۂ عمل میں نکلنا اور اس حوصلہ آزما زندگی کے تمام تقاضوں کو علیٰ وجہ الکمال پورا کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ انتہائی شرم وحیا اور خاکساری وفروتنی کو کسی عام رہنما کے لوازمِ حیات مثلاً خطابت، عوام کے نظم ونسق، وغیرہ سے بہت کم لگاؤ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اِس زندگی کے لیے جرأت وجسارت اور تحکم وبے باکی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلعم نے ان دو بظاہر متضاد حیثیتوں کو وصل دے دیا اور دُنیا نے دیکھا کہ ایک ہی انسان دُنیا کا سب سے بڑا ہادی اور حیائے کامل کا مظہر اتم بھی تھا! اور اُس کے ساتھ ہی اس برعکس حقیقت کو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ جب رسولِ اکرم صلعم نے ایک عظیم قائد اور سپہ سالار کا منصب سنبھالا تو اپنی انسانیت کبریٰ کے دامن میں اپنے حلم و انکسار اور عجز وفروتنی کے جوہر کو بدستور سلامت رکھا۔ صرف ایک فتح مکہّ کے واقعہ کو لے لیجیے۔ کیا تاریخ عالم اور کیا حضور صلعم کی اپنی حیاتِ طیّبہ، دونوں کے لیے اِس واقعے کی اہمیت خود بخود ظاہر ہے۔ فتح مکہّ کا دن عجیب دن تھا۔ اس دن خدا نے اپنے ہاتھ سے پیغمبر صلعم کے سر پر سطوتِ کبریٰ کا تاج رکھ کر اُسے دینی ودنیوی کامرانی کی اعلیٰ ترین معراج پر فائز کر دیا۔ اُسی شہر نے جہاں آپ کو گالیاں دی جاتی تھیں، جہاں اُس کے سر پر نجاستیں ڈالی جاتی تھیں، جہاں

اُس کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے، ہاں اُسی دارالکفر نے جو اب دارالاسلام بننے والا تھا، آج اپنے دروازے اُس کے لیے کھول دیے تھے۔

دُنیا کہے گی کہ آج کبر و غرور کے اظہار کا دن تھا۔ آج اُس جلا وطن کا سرِ جوشِ تفاخر میں ہفت افلاک سے بلند ہوتا تو بجا تھا، اور کسی ساز و یراق سے مرصع راہوار کی پشت پر بیٹھے ہوئے اُس کی پُرجلال آنکھوں کو قدم قدم پر اپنے دشمنوں کی رسوائی و نگوں ساری کا منظر دیکھنا چاہیے تھا، کیونکہ بظاہر اُسی کی حکمت و تدبر، اُسی کے ایثار و استقامت نے یہ دن دکھایا تھا کہ آج مکے کی فضا نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلے سے گونج رہی تھی۔ اسلام کی فوج تا بحدِ نگاہ ایک سمندر کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی جس کی موجیں ہر طرف سے بہتی اور اُمنڈتی آ رہی تھیں۔ ایک ایک سپاہی نشۂ شجاعت میں چور سینہ تانے ہوئے بلد الامین میں داخل ہو رہا تھا اور آفتابِ صبح کی روشنی میں مجاہدین کی کفر سوز تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ہزارہا جاں نثار، عقیدت مند، جن کے قدموں کی دھمک سے زمین لرز رہی تھی، اس وقت پیغمبر کے گرد حلقہ زن تھے، مگر وہ خود عاجزی اور فروتنی کی زندہ تصویر بنا ہوا اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔ اُس کا دل فتح و کامرانی کی اِس ساعت میں کسی اور جذبے سے سرشار تھا۔ ایک آزاد شدہ غلام کا بیٹا،[1] جسے اسلام کی مساوات نے سر آنکھوں پر جگہ دی تھی، اِس سواری میں اُس کا ردیف تھا اور فرطِ انکسار سے اُس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹ کے سامنے کے حصے سے لگا جاتا تھا۔

یہ کیفیت، جس کی تصویر ہم نے ابھی دیکھی۔ رسولِ پاکؐ کی انسانیتِ کاملہ کا ایک مستقل عنصر تھی۔ حضورؐ کے انکسار اور تواضع کی یہ کیفیت تھی اور تکبر سے اِس درجہ احتراز تھا کہ مدینے کی ایک مجذوب سی عورت نے اپنے کسی کام کے لیے حضورؐ کو راہ چلتے روک لیا تو شہنشاہِ عربؐ دیر تک سر رہ گزار بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔ چھوٹے بچے شوق سے سرورِ کون و مکان کے پاس آتے تھے۔ حضورؐ ان کو گود میں بٹھاتے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔

---

[1] حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ۔

آپ مکّہ مکرّمہ تشریف لائے تو بنی عبدالمطلب کے بچّے آپؐ کے استقبال کے لیے خوش خوش بھاگتے ہوئے آئے اور آپ نے نہایت شفقت سے اُن میں سے ایک کو اُٹھا کر اپنے آگے اور ایک کو پیچھے سوار کر لیا۔ ان حقائق پر غور کیجیے تو دُنیا کے عام واقعات و مشاہدات کی رو سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس مقدس انسان نے جذبۂ حِلم و محبت کو اس حد تک بڑھا یا تھا، اُس نے اپنے عظیم منصب کا رُعب اور دبدبہ بھی کھو دیا ہو گا۔ لیکن یہاں بھی وُہ وجودِ قدسی مقابل کی تکمیلی فضیلت سے بوجہ احسن بہرہ مند تھا اور اس کے خُلقِ انکسار کے اتمام کے لیے اس کا وقار موجود تھا۔ فتح مکّہ کے دن جب ایک شخص نے حضورِ رسالت میں آکر کچھ عرض کرنا چاہا تو جلالِ نبوی نے اس کے بدن پر لرزہ طاری کر دیا۔ آپؐ نے اُس کو اس طرح تشفّی دی، "گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سکھایا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

رسول پاکؐ کے خلقِ عظیم کی اکملیت زندگی کی ہر جنبش میں اُن متنوع فضائل کو باہم وصل دیتی تھی جن کو دُنیا کی آنکھ ہمیشہ الگ الگ دیکھتی رہی تھی۔ غور کیجیے کہ وُہی ایک انسان جس کا حلم و تحمّل اپنے خادم کو اس کی پُوری مدّت ملازمت ایک دفعہ بھی یہ کہنے کا روادار نہ ہُوا تھا کہ "تُو نے یہ کام کیوں کیا؟ اور وہ کیوں نہیں کیا ہے؟"[1] جس کا حُسنِ خُلق معاملاتِ ارشاد و ہدایت میں اتنا ذکی الحس تھا کہ کسی شخص کی نامطبوع حرکت پر، اُس کا نام لیے بغیر فقط اتنا کہہ دیتا تھا: "وہ کیسے لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں!" جو اپنی مروّت کے ہاتھوں خُود عقوبت میں گرفتار ہونا گوارا کرتا تھا لیکن دوسروں سے یہ کہنا بھی گوارا نہ کرتا تھا کہ تمہارے اس کام سے مجھے تکلیف ہوتی ہے،[2] جس کی آنکھوں کے لحاظ کی یہ کیفیت تھی کہ مصافحے میں اس وقت تک اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دیے رہتا، جب تک خود دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لیتا، اُسی ایک انسان کے سامنے جب بڑے بڑے معزز عمائد

---

[1] روایت حضرت انسؓ [2] یہی حقیقت اس آیۂ کریمہ کی شانِ نزول ہے: اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ۔

قریش کی طرف سے یہ سفارش آئی کہ قریشی مجرمہ فاطمہ بنت الاسود کا گناہ سرقہ اس کی عزت نسب کا لحاظ کر کے معاف کر دیا جائے، تو وہ قہرِ الٰہی کی تصویر بن گیا۔ اور اس نے غضب آلود لہجے میں فرمایا: "اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی یہ کام کرتی تو بخدا میں ضرور حد جاری کرتا۔" خلقِ نبوی کے اسی آسمانی اعتدال کے صدقے میں وہی ایک شمشیر جو صاعقۂ عدل بن کر عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث اور بنو قریظہ کی گردنوں پر چمکی تھی، آیۂ رحمت بن کر ہبار بن الاسود اور وحشی اور کوہِ تنعیم کی حملہ آور جمعیت کے سروں پر سایہ افگن ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ شاعر کے دل میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے لیکن جو غم اس عالمِ ہست و بود کے دھندلے نظاروں سے پیدا ہو اُسے اُس اندوہِ اکبر سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی جو عالمِ باقی کے جلووں سے وابستہ ہو۔ ہر وقت کی شگفتہ روئی، ہر وقت کا تبسّم ایسے شخص کا طبعی خاصہ نہیں ہو سکتا جسے بچپن ہی سے غور و فکر کی عادت ہو اور ایک زبردست حکمران، مدبر، اور سب سے بڑھ کر، ایک پیغمبر کے عظیم الشان فرائض جس کے ذمّہ ہوں۔ غور و فکر کی یہی عادت شعرا میں نالہ و فغاں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور حکماء کے لیے اُن کی "فلسفیانہ ترش روئی" یا کم از کم ایک مستقل اور دائمی محزونی و افسردہ خاطری کی علّت بن جاتی ہے جس کے تاریک بادل اُن کی پیشانی پر ہمیشہ چھائے رہتے ہیں، حضورؐ خواجۂ ہر دو سرا اگرچہ غم و اضطراب کے دو جہاں اپنے قلبِ پاک میں چھپائے ہوئے تھے۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں، اگر تم جانتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا۔" لیکن غمِ دو جہاں کا یہ بارِ عظیم بھی حضورؐ کو اِس حقیقت سے بے خبر نہ رکھ سکتا تھا کہ آپ کے صحابہ اور ملنے والے بھی آپ ہی کے نورِ تبسّم میں جیتے تھے۔ اسی لیے آپ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور ہر شخص سے خندہ جبین پیش آتے تھے۔ حضرت جریرؓ ابن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد میں بارہا حاضرِ خدمت ہوا مگر یہ اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ حضورؐ نے مجھے دیکھا ہو اور تبسّم کے انوار چہرۂ مبارک پر ہویدا نہ ہوئے ہوں۔ حضرت عبداللہ ابنِ حارثؓ کا قول ہے کہ میں نے

کسی شخص کو جنابِ رسالت مآبؐ سے زیادہ خوش خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا۔ شفائے عیاض میں ہے کہ دشمن ہو یا کافر، آپ ہر ایک سے بکشادہ پیشانی ملتے تھے۔ یہ وہ سحر تھا جس سے آپ کے مخالف بھی رام ہو جاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار جب آنحضرتؐ کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے تو ایک طرح حقیقت کے قریب پہنچ جاتے تھے۔

جس شخص کی تکریم و تعظیم اس حد تک کی جاتی ہو کہ اُس کا تھوک ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہو، اُس کا وضو کیا ہوا پانی زمین پر نہ گرنے پاتا ہو، اُس کی آواز کے بلند ہوتے ہی تمام دوسری آوازیں خاموش ہو جاتی ہوں، اُس کے اشارۂ ابرو پر بڑے بڑے شریف و نجیب اور غیور و عالی مرتبت عقیدت مند نوکروں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے ہوں، ایسے شخص کے دل میں اگر اپنے وقارِ منصبی کا خیال پیدا ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔ مگر یہاں کیا کیفیت تھی؛ زید بن سعنہ جو اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے، ان سے آنحضرتؐ نے کچھ قرض لیا تھا، اور اگرچہ ادائے قرض کی میعاد میں ابھی کچھ دن باقی تھے، اُنھوں نے تقاضا کرتے وقت آنحضرتؐ سے سخت درشتی اور بدزبانی کا سلوک کیا۔ آنحضرتؐ خاموشی سے سُنتے جاتے تھے اور مسکراتے تھے حضرت عمرؓ برافروختہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے انہیں روکا اور کہا: "عمرؓ! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اُسے حُسنِ تقاضا اور مجھے حُسنِ ادا کی تاکید کرتے۔"

الغرض جن فضائلِ اخلاق کو کمتر درجے کے انسان خود اپنے نقصِ فطرت کی بنا پر متناقض اور ایک جگہ جمع ہونے کے ناقابلِ خیال کرتے آئے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی ترکیب کو اعتدال پر لا کر ثابت کر دیا کہ وہ دراصل خلقِ انسانیت کی تکمیل و اتمام کرتے ہیں۔ اس طرح انسانِ کامل کے تصوّر کو محمد مصطفےٰؐ کی ذاتِ اقدس کے ذریعے سے حقیقی وجود نصیب ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

انسان کی ہڈی کے ہر جوڑ پر ایک صدقہ ہے ہر روز

جس میں سورج طلوع ہو، دو آدمیوں کے درمیان انصاف

کرنا صدقہ ہے، کسی آدمی کو سواری پر سوار ہونے میں یا اس کا

سامان اوپر لادنے میں مدد کرنا صدقہ ہے، ایک اچھی بات

صدقہ ہے، نماز کے لیے ہر قدم جو تم اٹھاتے ہو صدقہ ہے

اور تکلیف دینے والی چیز کا راستے دور کرنا بھی صدقہ ہے۔

(صحیح بخاری و مسلم)